علمی و تحقیقی مجلہ "محاکمہ" یونیورسٹی آف سیالکوٹ

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

ڈاکٹر زاہدہ فاضل، اسسٹنٹ پروفیسر اردو، یونیورسٹی آف جھنگ

صائمہ رمضان، اسکالر ایم ایس اردو، سپیریئر یونیورسٹی لاہور

دہلی سے اودھ کی جانب شعرا کی ہجرت: تاریخی وسیاسی پس منظر

Migration of poets from Delhi to Awadh: Historical and political background

Dr.Zahida Fazil, Assistant professor of Urdu, University of Jhang
zahidafaizal@gmail.com
Saima Ramzan, Scholar MS urdu, Superior University Lahore (city campus)
saimaramazan181@gmail.com

Abstract

The migration of Urdu poets from Delhi was a result of political and social turmoil in the city. Afterthe death of Aurangzeb Alamgir, the continuous decline of the Mughals led to British occupation.Along with the fall of the Mughal Empire, various nations rose to power and plundered Delhi, makingit nearly impossible to live there. Consequently, the masses, including poets and artists, deemed it a propriate to migrate from Delhi.The kingdom of Awadh became an attractive destination for these migrants, where poets and artistswere valued. Awadh offered prosperity and leisure, and the rulers of Awadh were also patrons ofpoets.When poets arrived in Awadh with their language, thoughts, and ideas, the atmosphere of Awadhgave a new direction to their creativity. The external world began to dominate over the internal.Matters of beauty and love shifted from sophistication to pragmatic dealings. The eloquence of the language improved. In poetry, ornate style, indulgence, rhyme structure, and exaggeration becameCommon. New themes were incorporated into poetry, which broadened the scope of the ghazal.In the Urdu language, new words with new meanings were also included. The eloquence andexpressiveness of the language increased. Poets broke free from the specific environment andSubjects of Delhi, and the themes of the ghazal expanded.

Keywords: Poets, Migration, Delhi, Awadh, Mughal, Language.

دہلی سے اودھ کی جانب شعراء اور فن کاروں کی ہجرت کے سیاسی، سماجی اور معاشی پس منظر کا جائزہ لیا جائے تو دو باتیں سامنے آتی ہیں ایک تو یہ کہ دہلی میں سیاسی، سماجی اور معاشی

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

حالات ہر لحاظ سے ایسے تھے کہ وہاں عام آدمی تو کیا امراء و وزراء کی زندگی اجیرن بن چکی تھی۔ دوسری طرف ریاست اودھ کے اپنے حالات کا جائزہ لیا جائے تو وہاں زندگی نسبتاً زیادہ آسان تھی ۔امراء و وزراء اور عام جاگیر داروں کے علاوہ نچلے طبقے کی عوام بھی بہت خوشحال تھی یہی سبب تھا کہ دہلی کے بیشتر لوگوں کا لکھنو،فیض آباد اور اودھ کے دوسرے شہروں کی طرف ہجرت کرنے کا، دوسرا دہلی سے نکلنے والے ان مہاجرین کے لیے مکانی لحاظ سے بھی ریاست اودھ یا اس کے دوسرے بڑے شہر، دکن، حیدر آباد یا بنگال کی نسبت زیادہ قریب تھا اور پھر شاہان اودھ میں اہل علم اور اہل فن کی قدر دانی کرنے والے بھی کثرت سے موجود تھے۔ دہلی سے اودھ کی جانب اہل علم و فن کی ہجرت سے پہلے ان حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے جس کی وجہ سے شعرا ہجرت پر مجبور ہوئے۔

ہندوستان میں اگر مغلیہ دور حکومت کو دیکھا جائے تو تخت نشینی کی جنگ، خانہ جنگی کی صورت میں یا برادر کشی کی صورت میں تقریباً ہر دور میں رہی ہے اور شہنشاہ کہلوانے کے لیے ہر بادشاہ کو اپنے بھائی بھتیجوں یا بیٹوں تک کے سر قلم کرنا پڑے۔ مثلاً ہمایوں کے بھائی اس کی تخت نشینی کے لیے رکاوٹ بنے، جہانگیر کو اپنے بیٹوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ شاہ جہان نے اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کے سر قلم کیے۔ ایسی خانہ جنگی کے باوجود ایک بات صاف نظر آتی ہے کہ جو بھی بادشاہ بنتا تھا اس میں دوسروں سے صلاحیتیں زیادہ ہوتی تھیں اور وہ ہر لحاظ سے اس قابل ہوتا تھا کہ بادشاہ بنے اور پھر ان کے امیر وزیر بھی پڑھے لکھے دور رس اور دانشمند ہوتے تھے لیکن اورنگ زیب کے بعد کے دور مغلیہ پر نظر دوڑائیں تو ایسی تمام روایات میں سے صرف خانہ جنگی اور برادر کشی کو انھوں نے زیادہ اپنایا اس کے علاوہ سیاسی لحاظ سے انہوں نے آباء سے کچھ نہیں لیا۔ ۱۷۰۷ء کے بعد بھی برادر کشیوں کا سلسلہ تو تھا ہی لیکن ان بادشاہوں کو نہ تو کوئی دانشمند وزیر پسند آتا تھا اور نہ ہی یہ بیرونی حملوں کا مقابلہ کرنے کے قابل تھے یہاں تک کہ ان کے اپنے قائم کردہ صوبے داروں نے بھی خود مختاری کے اعلانات کرنے شروع کر دیے تھے۔ سید ابو الخیر کشفی لکھتے ہیں:

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

"اورنگ زیب نے ہار کے دھاگے کی طرح برعظیم کے مختلف جغرافیائی خطوں کو آپس میں منسلک کر رکھا تھا اس دھاگے کے ٹوٹتے ہی یہ خطے ہار کے موتیوں کی طرح بکھر گئے۔ مرکزی حکومت کے کمزور ہونے سے مختلف صوبے بڑی حد تک خود مختار بن گئے۔ کئی انتشار پسند طاقتیں تاریخ کے دھاروں میں شامل ہو گئیں" 1

اورنگزیب کی وفات کے بعد دہلی کے حالات اتنی سرعت سے تبدیل ہوئے کہ دہلی میں رہنا ممکن نہ رہا۔ بقول ڈاکٹر ساجد امجد:

"اورنگزیب کی وفات اس انتشار کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جس نے مغلیہ سلطنت کو ریت کی دیوار کی طرح بڑھا دیا" 2

اورنگ زیب کا بڑا بیٹا محمد معظم بہادر شاہ اوّل کے لقب سے اپنے بھائیوں کو راستے سے ہٹا کر ۱۷۰۷ء میں حکمران بنا۔ ۱۷۱۲ء تک اس نے حکومت کی۔ اسے سکھوں، مرہٹوں اور راجپوتوں کی قتل و غارت گری کا سامنا کرنا پڑا۔ ثنا الحق اس کے انتظامی امور کے بارے میں لکھتے ہیں:

"انتظامی امور میں اتنی کم دلچسپی لیتا تھا کہ مورخوں نے اسے "شہ بے خبر" کے نام سے مشہور کر دیا" 3

۱۷۱۲ء میں جہاندار شاہ نے اپنے تین بھائیوں کو مختلف جنگوں کے بعد ختم کیا اور خود حکومت سنبھالی یہ بادشاہ بہت زیادہ عیاش، ظالم تھا اور امور سلطنت میں بھی کوئی درک نہ رکھتا تھا۔ دوست دشمن کی اسے پہچان نہ تھی۔ لال کنور نامی طوائف اس پر سوار تھی۔ اس کے عہد میں بادشاہت نے خوشامدی امیروں وزیروں کے ہاتھ آگئی تھی اور وہ بھی زیادہ لال کنور کے کنجر رشتہ داروں کے ہاتھ۔ یہ گویے اور بھانڈ انتظام حکومت سنبھالنے لگے تھے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار جہاندار شاہ کے عہد کو

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

مغلیہ حکومت کے زوال کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی لال کنور کے اختیارات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> "جہاندار شاہ کا مختصر عہد حکومت مغل سلطنت کے زوال و انحطاط کا نقطۂ آغاز تھا۔ یہ ظالم اور عیاش بادشاہ تھا...... لال کنور کے کمینے اور رذیل بھائیوں و دیگر رشتہ داروں کو سلطنت کے بڑے بڑے عہدے سونپ دیے گئے" 4

جہاندار شاہ کا عہد صرف ایک سال تک رہا۔ لیکن ایک سال میں جتنا انتشار اس نے پھیلایا یا جتنی طوائف الملوکی اور بد نظمی تھی شاید ہی کسی دور میں نظر آئے۔ جہاندار شاہ کے بھتیجے اور عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر نے سادات بارہیہ کی مدد سے ۱۷۱۳ء میں جہاندار شاہ اور اس کے عمائدین کو قتل کر کے اپنے والد اور بھائیوں کا بدلہ لے لیا اور خود تخت پر متمکن ہوا۔ سادات بارہیہ کی اس زمانے میں مقبولیت بہت زیادہ تھی۔ بلکہ ان پر تو "بادشاہ گر" کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ جسے چاہتے تھے بادشاہ بنا دیتے اور جسے چاہتے ہٹا دیتے تھے۔ فرخ سیر نے ۱۷۱۹ء تک حکومت کی۔ یہ بھی بہت ظالم تھا۔ اپنی بادشاہت کی تقویت کے لیے ہر طرح کی قتل وغارت اور ظلم و ستم کرنا اس کے لیے جائز تھا۔ مغلوں کے شاہی دستور کے مطابق کسی نابینا شہزادے کو تخت پر نہیں بٹھایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا فرخ سیر نے اپنے دس سالہ بھائی اور چچازاد شہزادوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دیں کہ آل تیمور میں کوئی اس کے عہد میں تخت کے قابل نہ رہے۔

سادات بارہیہ نے فرخ سیر کو بادشاہ بنوایا تھا۔ جب فرخ سیر نے ان کی مقبولیت کم کرنا چاہی تو اس تیموری شہزادے کو سادات بارہیہ کے پیروؤں نے ننگے سر اور ننگے پاؤں مارتے پیٹتے اور گھسیٹتے ہوئے وزیر اعظم سید عبداللہ قطب الملک کے پاس لائے اور اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھیریں اور پھر قتل کر دیا گیا۔ سادات بارہیہ میں سر کردہ دو اشخاص تھے سید حسین علی جو فرخ سیر کے عہد میں وزیر بخشی اور سپہ سالار جیسے اہم عہدے پر تھے اور دوسرے قطب الملک وزیر اعظم تھے۔

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

انہوں نے بادشاہ گری کا سلسلہ شروع کرر کھا اور مفاد پورے کرتے رہتے تھے۔اس سے ملک میں خاصی بد نظمی اور انتشار پھیلا۔ سید ابو الخیر کشفی لکھتے ہیں:

> " ایسا دور جس میں اختیار بادشاہ کے ہاتھ سے نکل کر افراد کی ذات میں مرکوز ہو گیا۔اس کا آغاز سادات باداشہ گر سے ہوتا ہے...... فرخ سیر کے عہد میں درباری سازشوں کا جال بچھ گیا۔ ایرانی تورانی اختلافات ابھرے اسی دور میں روہیلے طاقت بننے لگے "5

فرخ سیر کی معزولی کے بعد بادشاہ گر سادات نے رعایا کی دل جمعی کے لیے ایک نحیف ونزار شہزادے رفیع الدرجات کو بادشاہ بنادیا جو ساڑھے تین ماہ کے بعد فوت ہو گیا پھر اس کے بعد رفیع الدولہ کو انہوں نے بادشاہ بنایا وہ بھی کچھ دن بعد مر گیا۔ رفیع الدولہ کے بعد سادات نے روشن اختر کو محمد شاہ کے لقب سے ۲۸ر ستمبر ۱۷۱۹ء میں تخت شاہی پر بٹھایا۔ نظام الملک اس کا تجربہ کار وزیر تھا اور اس طوائف الملوکی کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ سو اس نے تورانی گروہ سے مل کر محمد شاہ کی حکومت کے دوسرے ہی سال سادات بارہیہ کا تختہ الٹ دیا۔ محمد شاہ کا عہد خاصہ طویل ہے۔ ۱۷۴۸ء تک اس نے حکومت کی۔ اگر تاریخی تناظر میں اس عہد کا جائزہ لیا جائے تو مغلیہ سلطنت کے زوال کا یہ مکمل نمونہ ثابت ہوتا ہے کیوں کہ مرہٹوں اور جاٹوں کی غارت گردیاں اور نادر شاہ کا حملہ اسی دور میں ہوا۔ جتنی تباہی اور بربادی اس دور میں ہوئی ابدالی کے حملے ۱۷۵۷ء اور پھر ۱۷۶۰ء کے علاوہ کہیں مثال نہیں ملتی۔ ایک تو یہاں ایرانی، تورانی اور کئی دوسرے گروہ بن گئے تھے دوسرا خود غرض اور ہوس پرست صوبے دار اور وزراء خود بھی مرہٹوں، جاٹوں اور نادر وغیرہ کو لوٹنے کی دعوت دیتے تھے۔ دوسری طرف بادشاہ کا یہ حال تھا کہ ایسے بیرونی حملوں کی خبریں وہ سنتا ہی نہ تھا یا ہنسی مذاق میں اڑا دیتا تھا۔ نظام الملک جو ایک مدبر وزیر تھا اور بہتری چاہتا تھا بادشاہ کا اس کے ساتھ یہ سلوک تھا کہ ایک تو نظام کی بہتری کے لیے اس کی کوئی بات سنتا ہی نہ تھا دوسرا اس قدر بے عزتی کرتا تھا۔ محمد شاہ سے پہلے تو مرہٹے محض اکا دکا حملہ کرتے تھے لیکن ۱۷۲۰ء کے بعد انہوں نے

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

منصوبہ بندی کے تحت حملے کرنا شروع کر دیے باجی راؤ کی قیادت میں ہر سال یہ حملہ کرتے لوٹ مار قتل و غارت کے بعد واپس چلے جاتے۔

۱۷۳۷ء میں مرہٹوں نے دہلی پر بھرپور حملہ کر کے مغلیہ سلطنت کا رعب داب بالکل ختم کر دیا۔ ان کے دو سال بعد ہی نادر شاہ ۱۷۳۹ء میں طوفان کی طرح نازل ہوا اور خوب لوٹ مار کی محمد شاہ کو قیدی بنا اور صلح کی شرائط پر کثیر تاوان لیا امن کی اس صورت میں عوام کے تھوڑے سے رد عمل کو سہارا بنا کر نادر شاہ نے خوب قتل و غارت کی۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اس قتل و غارت اور تباہی کا یوں نقشہ کھینچا ہے:

"ہر طرف تلواروں کی جھنکاریں.....زاری و فریاد کی صدائیں، سڑکیں اور گلی کوچے دو طرفہ لٹ رہے تھے اور مکانوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے" 6

اس عہد کی اقتصادی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو ایک طرف تو یہ لوٹ مار اور دوسری طرف سلاطین کی شاہ خرچیاں اس سے ملک میں نہایت قحط جیسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ تنخواہ دار تنخواہ کو روتے تھے اور کئی لوگ بے روزگار تھے۔ بے روزگار عوام تو ایک طرف فوجی محافظوں کا حال ثنا الحق کے الفاظ میں سنیے:

"معاشی حالب جب اتنی بگڑی تو بیچارے سپاہیوں کو اپنے گھوڑے اور کپڑے تک بیچنے پڑے اور ڈھال، تلوار تک گروی رکھنی پڑی" 7

مرزا رفیع الدین سودا نے ان حالات کو "قصیدہ تضحیک روزگار" "قصیدہ شہر آشوب" اور "ہجو شیدی فولاد خان کوتوال" میں بڑے خوبصورت اور عبرت ناک انداز میں بیان کیا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ہر طبقہ کے لوگ ہی مجبور، بے بس تھے۔ امراء وزراء خود ڈاکو چور لٹیرے بنے ہوئے تھے اور ڈاکوؤں کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ سوادنے اس دور کی شاعری میں انتظامی

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

خرابیوں، امراء کی سازشوں اور بادشاہ کی نااہلی کی پردہ دری کی ہے۔ محمد شاہ کے عہد کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو یہ دور سیاسی، سماجی اور معاشی ہر لحاظ سے زوال زدہ ہے۔

۱۷۴۸ء میں محمد شاہ کی وفات پر اس کا بیٹا احمد شاہ تخت شاہی پر بیٹھا اس نے ۱۷۵۴ء تک حکومت کی۔ اپنے مزاج اور کردار کے لحاظ ے یہ بادشاہ اپنے باپ سے بھی بڑھ کر رنگیلا تھا۔ طوائف بازی یا شراب اور رقص و سرور جتنا محمد شاہ کے عہد میں تھا احمد شاہ کے عہد میں اس میں بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ عورتوں کا یہ باداشہ خاص شیدائی تھا۔

احمد شاہ کے عہد کی اگر سیاسی صورت حال اور اس کے نظام حکومت کو دیکھا جائے تو یہ بھی افسوسناک ہے کیونکہ احمد شاہ ایک طوائف ادھم بائی کے بطن سے تھا لہذا جب یہ بادشاہ بنا تو سارا نظام اسی طوائف کے ہاتھ میں تھا یا پھر اس کے منتخب کردہ رذیل اور گھٹیا لوگ تھے عنان حکومت جن کے ہاتھ میں تھا۔ یہ ایسے نازک اور افسوسناک حالات تھے کہ جو چند نیک اور دانش مند لوگ موجود تھے ایسے لوگوں کے سامنے اپنی بے عزتی کروانے سے بہتر سمجھتے ہوں گے کہ گھر بیٹھے رہیں۔ دربار کی تو یہ حالت تھی ہی لیکن سابقہ روایت کی طرح خود مختاری کے خواب دیکھنے والے صوبے دار بھی ایسی حالت میں نہ چوکتے تھے خواہ ان کو دشمنوں کی مدد سے ہی مرکز کو کمزور کرنا پڑتا وہ کرتے تھے۔ اور یہ ان کا معمول بھی بن چکا تھا۔ امرا اور صوبے دار اپنے معمولی مفاد کی خاطر بھی آپس میں لڑتے جھگڑتے اور معمولی مفاد کی خاطر دشمن سے مدد لینے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔

۱۷۵۲ء میں وزیر صفدر جنگ کے ایما پر سورج مل جاٹ نے دہلی اور نواح کو تین روز تک لوٹا کھسوٹا اور ہزاروں گھروں کو بے چراغ کر دیا۔ احمد شاہ نے صفدر جنگ کو وزارت سے ہٹا کر عماد الملک کو وزیر بنایا لیکن اس سے بھی زیادہ دیر بن نہ آنے کی وجہ سے نقصان اٹھایا۔ ۱۷۵۴ء کو عماد الملک نے احمد شاہ اور اس کی ماں ادھم بائی دونوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دیں اور اندھا کر دیا۔ میر نے شاید اسی موقع پر کہا تھا:

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

؎ شاہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاک پا جن کی انہی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں (میر)

احمد شاہ کے دور کا مجموعی جائزہ ابو الخیر کشفی کے الفاظ میں یوں بیان ہوتا ہے۔

"مغل بادشاہت کا اقتدار اور وقار ختم ہو گیا۔ شمالی ہند میں ہر طرف انتشار پھیل گیا"8

ثنا الحق کہتے ہیں کہ احمد شاہ اور اس کی ماں کے اس سانحہ سے لوگ بہت خوفزدہ ہوئے اور دلی چھوڑنا شروع کر دیا۔

"جو لوگ قدم جمائے ہوئے دلی میں بیٹھے تھے اور تمام انقلابات کو صبر سے برداشت کر رہے تھے اس سانحہ عظیم سے بے انتہا سراسیمہ ہوئے اور انہوں نے دہلی کی سکونت ترک کرنی شروع کر دی"9

احمد شاہ کو گرفتار کرنے کے بعد عماد الملک نے عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھایا۔ اس کا عہد بھی سیاسی اور معاشی لحاظ سے نہایت تباہ حال ہے۔ احمد شاہ ابدالی کی قتل و غارت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ابدالی ۱۷۵۷ء میں دہلی میں وارد ہوا۔ اپنے مزاج اور کردار کے لحاظ سے یہ ظالم شخص نہ تھا لیکن اس کی فوج زیادہ وحشی اور اجڈ تھی۔ چونکہ یہ نادر کا جرنیل تھا اور اس کی فوج بھی نادر شاہ ہی کی اگلی نسل تھی مغلیہ سلطنت کو لوٹنے کی روایت ان میں تھی اس کا چسکا ابدالی کی فوج کو بھی تھا۔ جب ابدالی نے حملہ کیا تو میر تقی میر دہلی ہی میں تھے۔ یہ سارا خون خرابہ ان کا دیکھا بھالا ہے۔ جس کا ذکر انہوں نے "ذکر میر" میں کیا ہے۔ یہاں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے حوالے سے "ذکر میر" کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ میر لکھتے ہیں:

"تھوڑی رات گذرے در انہوں نے دست تطاول دراز کیا۔ شہر کو آگ لگا دی گھروں کو لوٹ کر جلا ڈالا...... تین دن اور تین رات تک یہ ظلم جاری رہا۔ درانیوں نے کھانے اور پہننے کی کوئی چیز نہ چھوڑی...... بہت سے لوگ دلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں مر کھپ گئے"10

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

ابدالی، نجیب الدولہ کو دہلی کا مختار کل بنا کر چلا گیا۔ بادشاہ نے اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے عماد الملک کی مدد مانگی مرہٹے عماد الملک کے ساتھ تھے اس وجہ سے دہلی پھر مرہٹوں کا مرکز بن گیا۔ سیاسی صورت حال کو ابدالی نے مسخ کر دیا تھا اور پھر معاشی بدحالی کی کسر نجیب الدولہ کی فوج کے اخراجات نے پوری کر دی اور پھر اب مرہٹوں کی امن پسند لوٹ مار اور اخراجات لہٰذا ۱۷۵۷ء کا سال سیاسی اور معاشی بدحالی کے لحاظ سے اپنی مثال نہیں رکھتا۔

میر تقی میر نے اپنے ایک شہر شوب میں بھی ان حالات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ غزل میں بھی میر اور ان کے علاوہ بھی تمام شعراء کے کلام ایسے حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں — تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا (میر)

شاہ و گدا کی حالت یکساں ہے میرے صاحب — تنخواہ دار بھوکے، روزینہ دار فاقے (فغاں)

۱۷۵۹ء میں بھی نجیب الدولہ شجاع الدولہ اور دوسرے مسلمان افراد نے مرہٹوں کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو بلایا ادھر مرہٹوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے بھی اپنی ساری فوج جمع کر لی اسی دوران عماد الملک جو مرہٹوں کا خیر خواہ تھا اور دھوکے سے عالم گیر ثانی کو ۱۷۶۰ء کو قتل کروا دیا۔ ابدالی بھی اسی دوران پہنچ گیا اور مرہٹوں سے فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں ابو الخیر کشفی کے مطابق تقریباً دو لاکھ مرہٹے سپاہی مارے گئے۔ ابدالی نے عالی گہر کو شاہ عالم ثانی کا لقب دے کر تخت پر بٹھایا۔ مرہٹے اتنا نقصان اٹھانے کے باوجود شاہ عالم ثانی پر مسلط رہے ان کے بعد شاہ عالم روہیلوں کا اسیر اور کٹ پتلی بنا رہا۔ غلام قادر روھیلہ نے ۱۷۸۸ء میں اس کی آنکھیں نکال دیں۔ مرہٹے اس پر مسلط تھے اور اس سے بہت سے کام نکلواتے تھے لہٰذا مرہٹہ سردار سندھیا نے غلام قادر کو قتل کر کے دہلی پھر شاہ عالم ثانی کو دلوا دی۔ مغل تاریخ میں یہ پہلا بادشاہ تھا جو اندھے ہونے کے بعد بھی بادشاہ بنا دیا گیا۔ غلام قادر روہیلہ نے جو قتل و غارت لوٹ مار اور شہزادیوں کی آبروریزی کی اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ دہلی جتنی بار بھی لٹی حرم

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

محفوظ رہا اور لوٹنے والے بھی محض زر و جواہر تک محدود رہے۔ لیکن روہیلہ نے ظالمانہ اور سوقیانہ رویہ اختیار کیا۔

مغل بادشاہوں سے اب اس سے زیادہ اور کیا بے بسی ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرنے کے قابل بھی نہ رہے تھے۔ دہلی میں جب بادشاہوں کا یہ حال تھا تو عام رعایا کس حساب کتاب میں۔ ایسے حالات میں وطن سے زیادہ عزت کی حفاظت زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ ایک طرف تو بادشاہ کی یہ حیثیت تھی دوسری طرف اس کے کردار کا جائزہ لینے سے اس دور اور ان بادشاہوں پہ خون کے آنسو رونے کو دل کرتا ہے۔ اپنے کردار کے لحاظ سے بھی یہ بادشاہ اپنے اسلاف سے ذرا مختلف نہ تھا بلکہ ان سے کئی قدم آگے ہو گا۔

اس کے اسلاف بھی تو عورتوں کے عشق میں غرق رہتے تھے۔ لیکن کسی طوائف یا معشوق کو یہ نہ سوجھ سکتی تھی کہ وہ بھرے دربار میں بادشاہ کو ذلیل کرتے یا امراء وزراء جتنی مرضی بد دیانتیاں یا ہوس و حرص میں دغا بازیاں کر لیتے تھے۔ قتل کر دیتے تھے لیکن اتنی جرأت کسی میں نہ ہوتی تھی کہ وہ بادشاہ کو بھرے دربار میں گالی گلوچ کرے۔ شاہ عالم ثانی کو ایسی چیزیں بھی برداشت کرنا پڑتی تھیں بلکہ عورتوں کے بے عزتی کرنے پر تو وہ خوش بھی ہوتا تھا۔

اس دور تک آتے آتے تو حالت یہ ہو گئی تھی کہ بادشاہ بادشاہ نہیں ہے بس ایک اونچے طبقے کا امیر ہے جس کے برابر کے اور بہت سے لوگ ہیں اس کی وجہ بھی پوشیدہ نہیں کہ ایک تو آئے دن صوبے داروں کی خود مختاریوں کے اعلانات۔ غیر ملکی حملوں سے ہمیشہ شکست کھانا نیز انگریزوں کی عمل داری کی بڑھتی ہوئی فضا یہ اسباب مغل شہنشاہوں کی قدر و منزلت گھٹانے والے جاسکتے ہیں۔ اس دور میں تو بس نام کے بادشاہ تھے جن کو انگریزوں سے وظیفہ ملتا تھا اور اسی پر ان کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ اس میں بھی انگریز کبھی وظیفہ کم کر دیتے کبھی روک لیتے۔ اس عہد پر یہ مثل بالکل صادق تھی۔ جس کا ماخذ یہی حالات تھے کہ "خلق خدا کی ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

بہادر کا" شاہ عالم ثانی ۱۸۰۶ء میں فوت ہوا۔ ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۷ء تک اکبر شاہ ثانی اور ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء تک بہادر شاہ ظفر بھی صرف نام کے بادشاہ رہے۔ ان دونوں بادشاہوں کے عہد کے تجزیے کے لیے بس ابو الخیر کشفی کی یہ رائے کافی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

"اس دور میں مغل بادشاہ کا ملک کے انتظام سے کوئی علاقہ نہ رہا۔ وہ کمپنی کا پنشن خوار تھا اور پنشن کا وقت پر ملنا یا اس میں اضافہ ... یہ تھا اس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ" 11

مغلیہ دور کے اگر اس ڈیڑھ سو سالہ عہد کا (۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء) کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو ایسے ہی حالات سامنے آتے ہیں۔ آہستہ آہستہ زوال یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ شاہ سے گدا ہو جاتے ہیں۔ عام انسانی تقاضے سے تو دیکھا جائے تو گدا بھی انسان ہی ہوتے ہیں لیکن اگر انسانیت کے اس پہلو کی طرف دیکھا جائے کہ اسے کیا عروج نصیب تھا اور پھر کسی زوال کا سامنا کرنا پڑے یہ زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مغل شہزادیاں جنہوں نے جب کبھی بھی بھوک پیاس کا نام نہ سنا تھا جب انہیں تین تین دن فاقے ملتے ہیں تو یہ شاہی سے گدائی ہی کی صورت حال ہے۔ عبد الحیٔ تاباں نے شاید انہی حالات کی پیشین گوئی کی تھی۔

؎ فرش پر مخمل کے جو سوتے تھے ہائے
اب میسر ان کو نہیں ہوتا ہے ٹاٹ (تاباں)

ان دلائل اور تاریخ شواہد کے پیش نظر اگر دہلی کے شعراء اور فن کاروں کی ہجرت کا جائزہ لیا جائے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ بادشاہوں کے حالات یہ تھے کہ روٹی کے ٹکڑے کو ترستے تھے اور اپنی مرضی سے کوئی کام سرانجام نہ دے سکتے تھے تو عام لوگوں کی صورت حال کیا ہو گی۔ گو انگریز حکمرانوں کی زیادہ سختی سلاطین مغلیہ یا خاندان مغلیہ پر تھی اور عوام پر اتنی زیادہ پابندی نہ تھی لیکن شعراء یا فن کار جو طبعاً حساس ہوتے ہیں۔ ایسے گھٹے ہوئے ماحول میں کس طرح رہ سکتے تھے اور پھر جتنے خوشحال مغلیہ دور میں تھے

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

یا ان کو وظیفے، خلعتیں اور انعام ملتے تھے یا قدر کی جاتی تھی اتنی انگریز نہیں کرتے تھے۔ مغل سلاطین تو مشرقی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے اور ان کو اپناتے ہوئے اہل فن کی قدر کرتے تھے یا شعراء کو نوازتے تھے لیکن انگریز حکام کو مشرقی روایات یا ان کی پاسداری سے کوئی سروکار نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے وہ ان اہل علم و ہنر کو اتنا زیادہ نہیں نواز سکتے تھے۔ جمیل جالبی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"اہل ہنر کی سرپرستی کرنے والے امراء اس دنیا سے اٹھ چکے تھے اور جو باقی تھے وہ خود روٹیوں کے محتاج تھے"12

اس سرپرستی کے نہ ہونے کی وجہ سے اور دوسرا یہاں کے معاشی حالات اور قتل و غارت سے اپنے احباب تک کا یہاں نہ ہونے کی وجہ سے بھی اہل فن کا یہاں گزارانہ ہو سکتا تھا۔ گھروں و گلی کوچوں کے اجڑ جانے کی وجہ سے یہ ماحول خود ان اہل فن کے لیے اجنبی بن گیا تھا جہاں انہیں معاشی سہولت بھی میسر نہ تھی۔ چنانچہ میر تقی میر جب پانی پت کی تیسری جنگ ۱۷۶۰ء کے بعد دہلی آتے ہیں تو یہاں کا ماحول دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں کہ یہاں نہیں رہنا۔ ثناالحق نے "ذکر میر" کے حوالے سے لکھا ہے:

"وہاں کوئی شناسا تک نہ ملا کہ دو گھڑی باتیں کر لوں، کھڑا حیرت سے تکتا رہا۔ سخت صدمہ ہوا اور عہد کیا کہ اب پھر نہ آؤں گا اور جب تک زندہ رہوں شہر کا قصد نہ کروں گا"13

ان شعراء اور فن کاروں کے دہلی سے ہجرت کرنے کے تو یہ اسباب تھے کہ نہ تو یہاں ان کے احباب رہے تھے نہ ہی قدر دان اور نہ ہی انہیں یہاں معاشی آسودگی حاصل رہی تھی۔ دوسری طرف اگر ہم لکھنؤ،فیض آباد یا اودھ کے دوسرے شہروں کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا جائزہ لیں تو وہاں ان اہل فن کی دلچسپی کے تمام سامان میسر تھے۔ یوں تو حیدرآباد، بنگال وغیرہ یا

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

دکن میں بھی یہ سہولتیں میسر تھیں اور کچھ لوگ دہلی سے نکل کر وہاں گئے بھی لیکن ان کے مقابلے میں لکھنؤ تو بہت قریب تھا۔ اس لیے شعراء اور فن کاروں نے دہلی میں خوار ہونے کے بجائے اودھ کی ریاست میں پناہ لینا ضروری خیال کیا کہ یہاں ان کے قدردان بھی موجود تھے۔ تمام شاہان اودھ یا نواب وزیر شاعر بھی تھے اور شاعری و موسیقی کے قدردان بھی دوسرا یہاں کی معاشی حالت تقریباً تمام ہندوستان سے زیادہ بہتر تھی۔ اب ذرا اختصار سے ریاست اودھ کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا تاریخی تناظر میں جائزہ لیتے ہیں جس سے اہل فن کو اس میں کشش واضح ہو جائے گی۔

مغل سلطنت کا مرکز اکثر دہلی ہی مستقل طور پر رہا اور پورے ملک کے انتظام کے لیے الگ الگ صوبے بنا کر وہاں صوبے دار یا گورنر بھیجے جاتے تھے اور نگ زیب کے بعد ان صوبے داروں نے خود مختاری کے خواب دیکھنا شروع کر دیے تھے اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ انگریزوں کی حمایت اور اپنی چالاکیوں کی وجہ سے اس میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ ریاست اودھ کا حال بھی ایسا ہی ہے۔ عہد محمد شاہ میں سید محمد امید سعادت خان برہان الملک ۱۷۲۲ء میں اودھ کا صوبے دار مقرر ہوا۔ جو ۱۷۳۹ء تک صوبے دار یا نیم فرمانروائی کرتا رہا۔ اصل میں یہ فرمانروا ہی تھے کیوں کہ مغل بادشاہوں کے حالات ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کو تو یہی امراء وزراء بادشاہ بناتے تھے بس نام اور خطبہ شہنشاہ کا پڑھا جاتا تھا اس کے علاوہ ریاست کے تمام سیاہ و سفید کے مالک صوبے دار ہی ہوتے تھے۔ انہیں صرف بادشاہ کے ہاں جا کر حاضری دینا پڑتی تھی یا تحفے تحائف دینا ہوتے تھے۔

برہان الملک سلطنت اودھ کا بانی کہلاتا ہے کیوں کہ اس کا حسن انتظام اور نظم و نسق یا فوجی قوت اور معاشی طاقت اسے خود مختار ہی ثابت کرتی ہے۔ تمام ریاستوں کی طرح اودھ میں بھی چھوٹے چھوٹے جاگیر دار اور سردار خود سر ہو گئے تھے یہاں تک کہ غیر ملکی حملہ آوروں کے

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

ساتھ مل کر حکومت سے بھی ٹکر لے لیتے تھے۔ ریاست اودھ کے ان تمام خود سر سرداروں کو برہان الملک نے بہت جلد درست کر لیا اور کثیر رقم ان سے جو واجب الادا ہوتی تھی وصول ہونا شروع ہو گئی۔ فوجی قوت بھی اس اس نے خاصی مستحکم کی۔ ۱۷۳۹ء میں سعادت خان برہان الملک کا بھانجا اور داماد نواب صفدر جنگ صوبے دار مقرر ہوا۔ یہ بھی غرباء پروری میں اور عدل و انصاف و حسن انتظام سلطنت میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ اس کے علم و ادب کے شوق کے بارے میں ڈاکٹر سید صفدر حسین لکھتے ہیں:

"صفدر جنگ کو ادب و شعر کا بڑا اچھا ذوق تھا...... انہیں نے بہت سے علماء اور فضلاء کی بھی قدر دانی کی 14"

۱۷۵۴ء کو صفدر جنگ کے انتقال پر اس کا بیٹا شجاع الدولہ اودھ کا صوبے دار مقرر ہوا۔ یہ بہت باتدبیر اور ماہر سیاست تھا، چنانچہ اس دور میں انگریزوں کا عمل دخل بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ اور انہوں نے فوجی قوت کو مستحکم کرنے پر بھی پابندی لگا دی تھی کہ پینتیس ہزار سے زائد فوج نہ رکھی جائے۔ پھر بھی آنے والے شاہان اودھ کی نیت شجاع الدولہ نے ہر لحاظ سے انگریزوں کی برابری کا احساس برقرار رکھا۔ ۱۷۶۴ء میں جنگ بکسر کے دوران اس کی فوج قوت تقریباً ختم ہو گئی جس کی وجہ سے اس نے عیش و نشاط کے دامن میں پناہ لی۔ مزاج اور کردار کے لحاظ سے تو ہر دور کے امراء ہی بگڑے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح اودھ کے وزراء بھی اپنے آقاؤں کی پیروی میں پیش پیش رہتے تھے۔ شجاع الدولہ بھی اس لحاظ سے بری نہیں ہے۔ شجاع الدولہ یا دوسرے نواب وزراء کا ایسا کردار اپنی جگہ لیکن اس عیاشی سے ان کی ملکی مالی حالت کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ کتنے فارغ البال اور خوشحال ہوں گے۔ علم و ادب اور آرٹ وغیرہ کا ذوق و شوق اور اہل علم و ہنر کی قدر دانی کا عنصر شجاع الدولہ میں نمایاں ہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین لکھتے ہیں:

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

''شجاع الدولہ کے دم تک تمام ملک میں بہتات فراغت اور خوشحالی موجود تھی جس کی وجہ سے دربار کی علمی و ادبی اور تہذیبی روایات تمام ملک میں پھیل چکی تھیں''15

شجاع الدولہ کے عہد کی اقتصادی صورت حال کا جائزہ لیں تو بھی ہر لحاظ سے خوشحالی ہی نظر آتی ہے چنانچہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے مطابق شجاع الدولہ کا عہد تھا کہ یہاں اردو کے باکمال شعراء کی آمد شروع ہوئی۔ آصف الدولہ ۱۷۹۷ء میں فوت ہوا تو وزیر اعلی خاں، وزیر اودھ بنا لیکن انگریزوں نے اپنے اختیارات کو استعمال میں لاتے ہوئے سعادت علی خان کو وزیر بنوایا کیوں کہ یہ ان کے لیے زیادہ سود مند ہو سکتا تھا اور پھر اس نے ۷۶ لاکھ روپیہ بطور خراج بھی ادا کیا تھا۔ آخر دور میں اودھ کی آدھی سلطنت بھی انگریزوں نے اس سے ہتھیالی تھی۔ اس کے باوجود جتنا ملک رہ گیا تھا اس کا انتظام و انصرام بڑے اچھے انداز سے کیا اور عوام کو خوشحال رکھا۔ ارباب علم کے واقعی بڑے قدردان تھے خود بھی اچھے انشاء پرداز اور دقیقہ سنج و بذلہ سنج تھے۔ ادب میں صناعی سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ فصاحت و بلاغت، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ان کا خاصہ تھی۔ انشاءاللہ خان انشاء نے ''دریائے لطافت'' انہی کے کہنے پر لکھی اور پھر ''لطائف السعادت'' کے نام سے ان کے خوش فکر لطیفے بھی مرتب کیے۔

شاہان اودھ میں غازی الدین حیدر کا دور خاصہ اہم ہے۔ ۱۸۱۴ء میں یہ وزیر یا صوبے دار مقرر ہوا۔ ۱۸۲۰ء کو اس نے انگریزوں کی شہ پر اودھ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس سے وہ رسمی تکلف اودھ کی صوبے داری کا بھی ختم ہو گیا اور مرکز سے بے نیاز ہو گیا۔ بادشاہت کے اعلان پر اس نے جشن کیا اور تاج و تخت مغلیہ سلطنت کی طرز پر بنوایا۔ جس پر دو کروڑ روپیہ خرچ کیا۔ عالم شہزادگی سے ہی یہ بھی لہو و لہب میں مبتلا تھا لیکن اس کے علاوہ اسے اختراعات اور ایجادات کا بھی بڑا شوق تھا خود بھی فلسفہ لسانیات اور ادب سے خاص دلچسپی رکھتا تھا اور اس لیے شعراء اور اہل فن کو نوازنے میں بھی بڑا فیاض تھا۔

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۷ء تک امجد علی شاہ رہا یہ مذہبی آدمی تھا اس وجہ سے اس نے تو شعراء کی تنخواہیں بھی بند کر دیں تھیں۔ اس کی کسر واجد علی شاہ نے نکالی۔ واجد علی شاہ اختر ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۶ء تک بادشاہ رہا۔ یہ خود بھی شاعر تھا اور موسیقی و ادب سے خاص دلچسپی رکھتا تھا۔ موسیقی میں کئی راگ راگنیاں اس کی اختراعات ہیں ادب میں رہیس پر اس نے خاص توجہ دی۔ جسے ڈرامے کی ابتدائی شکل کہا جا سکتا ہے۔ مغلیہ سلاطین میں آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور سلاطین اودھ میں واجد علی شاہ اختر ایک ہی جیسا ذوق رکھنے والے تھے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے شرر کے حوالے سے واجد علی شاہ کے عہد کو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ قرار دیتا ہے۔ جس میں علم و ادب کی سرپرستی اور اہل فن کی قدر دانی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ واجد علی شاہ اختر نے اپنی مثنوی "حزن اختر" میں اہل فن کی قدر دانی یا دربار سے ان کی وابستگی کا ذکر کیا ہے وہ کئی ہزاروں تک ہے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی "حزن اختر" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"واجد علی اختر نے اپنی مثنوی "حزن اختر" میں بتایا ہے کہ ۱۷۰۰ اہل قلم ۵۰۰ طبیب اور ۱۵۰۰ چوبدار ان کے ملازم تھے" 16

اس میزان سے ان بادشاہوں کی اہل فن کی قدر دانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ وہ دور ہے جب بادشاہ کو انگریز حکام کے بغیر کوئی معمولی سا کام کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی لیکن اس کے باوجود علم و ادب کی اس قدر سرپرستی واقعی مثالی ہے۔ ان تمام شاہان اودھ کا اگر جائزہ لیا جائے تو نہ صرف یہ اہل علم و فن کے قدر دان تھے بلکہ خود بھی اکثر شاعر تھے۔ آصف الدولہ آصف، وزیر علی وزیر، سعادت علی خان، غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر اور واجد علی اختر شاعر تھے اور ان کا کلام کلیات کی صورت میں یا مختلف تذکروں میں محفوظ ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ اودھ میں پہنچنے والے شعراء اور اہل فن کا تذکرہ کیا جائے یا ان اسباب کا تجزیہ کیا جائے سب سے پہلے ضروری ہے کہ اودھ کی اقتصادی اور معاشی حیثیت کا جائزہ لیا جائے اور یہاں

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

دولت کی فراوانی کے اسباب کا جائزہ لیا جائے کہ آخر ریاست معاشی اعتبار سے خوشحال کیسے ہوئی۔

اودھ کی خوشحالی کا تمام تر دارومدار زراعت پر تھا۔ زرخیز زمین، بارش اور معتدل آب وہوا اس پر ممد ثابت ہوتی تھی تقریباً ہر فصل یہاں کثرت سے ہوتی تھی پھلوں اور پھولوں کے باغ بھی یہاں کثرت سے ہوتے تھے۔ خوشبودار پھولوں سے عرق اور بہترین قسم کے عطریات بنائے جاتے تھے۔ زراعت کے علاوہ صنعت کاری میں یہاں صرف پاچہ بافی کو زیادہ فروغ ہو سکا تھا۔ اودھ کے مختلف شہروں میں نہایت قیمتی اور نفشین کپڑا بنتا تھا۔ اس میں سوتی، ریشمی، ململ، چھینٹ، کمخواب، زردوزی اور سونے چاندی کی کشیدہ کاری والے کپڑے کثرت سے یہاں تیار ہوتے تھے جو اشیاء اور یورپ کے ملکوں کو فروخت بھی کیے جاتے تھے۔ ڈاکٹر صفدر حسین لکھتے ہیں:

"اودھ کی ان مصنوعات کی تجارت بیرونی ممالک کی منڈیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سامان خشکی اور تری دونوں راستوں سے کبھی دہلی، لاہور، کابل اور وسط ایشیا کی طرف سے کبھی مصر، ہالینڈ، فرانس اور برطانیہ بھیجا جاتا تھا" 17

یہ تو یہاں کی معاشی ترقی اور خوشحالی کا تذکرہ تھا اگر اودھ کی معاشرتی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو بھی عوام بڑی خوشحال اور مرفع تھی اور سلاطین اپنی عیاشیوں اور انگریز غلامیوں کے باوجود عوام کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے اور ہر چھوٹے بڑے طبقے کے لوگوں کے لیے زندگی نہایت آسان ہوگئی تھی۔ ان سلاطین اودھ کی رعایاپروری کا جائزہ بھی ہمارے موضوع کے لیے بہت مفید ثابت ہو گا۔

امراء وزراء اور درمیانے طبقے کے جاگیرداروں کی خوشحالی کا توذکر ہی کیا۔ یہاں نچلے طبقے کے لوگ بھی بہت خوشحال تھے۔ اس وقت تقریباً سارے ہندوستان میں عام مزدور کی تنخواہ

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

تین روپے ماہانہ کے قریب تھی اودھ کے علاوہ کسی علاقے میں تین روپے جس گذر بسر مشکل تھا لیکن یہاں اشیاء اتنی سستی تھیں کہ عام مزدور بھی اتنی تنخواہ میں آسانی سے زندگی بسر کر سکتا تھا۔ شاہ خرچیوں کے علاوہ عوام اور خواص میں جو مختلف ذوق تھے۔ کبوتر بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی، طوائف بازی اور سیر و شکار سے جتنی دلچسپیاں ظاہر ہوتی ہیں ان سے اس معاشرے کی عوام کی خوشحالی اور فارغ البالی کا پتہ بھی ملتا ہے۔ لہذا اس جائزہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ معاشرہ اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود خوشحال تو تھا ہی اور یہاں زندگی گزارنے کا وافر سامان موجود تھا۔ یہی اسباب ہیں جو اہل علم و فن کے لیے اودھ لکھنؤ اور فیض آباد کشش رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں:

"دولت کے دریا بہہ رہے تھے آسمان سے ھن برس رہا تھا دور دور سے باکمال اور اہل فن کھینچے چلے آرہے تھے اور لکھنؤ تھا کہ ہر ایک کے لیے اس کی آنکھیں فرش راہ تھیں"18

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اپنی کتاب "لکھنو کا دبستان شاعری" میں دہلی سے لکھنؤ یا فیض آباد ہجرت کرنے والے شعراء کی تعداد تقریباً پندرہ بتائی ہے۔ اور ان میں باکمال اساتذہ فن خان آرزو، میر تقی میر، مرزا سودا، میر حسن دہلوی، میر سوز، قلندر بخش جرأت، میر انشاء اللہ خان انشاء، غلام ہمدانی مصحفی اور نسیم دہلوی وغیرہ تو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تمام شعراء میں سے بہتر کو سلاطین اودھ خود دعوت دیتے تھے۔ اور زاد راہ دے کر بلاتے تھے۔ پھر یہاں ان کی باقاعدہ تنخواہ یا وظیفہ بھی لگاتے تھے۔ چنانچہ آصف الدولہ کے عہد میں سودا موجود تھے اور دو سو روپے مشاہرہ لیتے تھے۔ پھر ان کے مرنے کے بعد آصف الدولہ کو خیال آیا کہ میر کو بلوایا جائے چنانچہ انہیں زاد راہ دے کر بلوایا اور تین سو روپے وظیفہ مقرر کیا۔ ان باقاعدہ وظیفوں کے علاوہ مختلف اوقات میں انعام و اکرام ان کے علاوہ ہے۔ پھر اکثر شعراء کے متاثرین اور قدردانوں میں شہزادے بھی ہوتے تھے جو گاہے بگاہے انہیں نوازتے رہتے

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

تھے۔ مثلاً جرأت کے قدر دانوں میں نواب محبت اللہ خان اور شاہزادہ سلیمان شکوہ قابل ذکر ہیں۔

شعراء کے علاوہ فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے بہت سے فن کار بھی اودھ میں موجود تھے اور شاہان اودھ کی قدر دانی اور عزت افزائی سے خوشحال تھے۔ فن تعمیر کا ان تمام نواب وزیروں کو بہت شوق تھا۔ اس کے علاوہ مصوری بھی ان وزرا کا خاص شوق تھا چنانچہ دہلی سے جانے والے بہت سے مصور یہاں آکر آباد ہوئے۔ اودھ کے مشہور مصوروں میں ٹھاکر داس، محمد علی (مانی رقم)، فضل علی (بہزاد رقم)، بیچو بیگ، صاحب رائے، کاظم حسین خاں درگاہ پرشاد وار کاشی رام وغیرہ کے نام بھی صفدر حسین نے گنوائے ہیں۔ خطاطی کا فن بھی مغل سلطنت کی خاص پہچان ہے چنانچہ دہلی کی تباہی کے بعد اودھ نے اس فن کی بھی بڑی سرپرستی کی۔ حافظ نور اللہ، قاضی نعمت اللہ اور عباد اللہ بیگ یہ تینوں نستعلیق کے ماہر خطاط آغا عبدالرشید کے شاگرد تھے جو لاہور سے اودھ پہنچے اور آصف الدولہ کے عہد میں آئے تھے۔ مغل شہنشاہوں اور شاہان اودھ کی موسیقی اور رقص و سرود سے دلچسپی کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ اودھ میں شجاع الدولہ کے عہد سے یہاں موسیقاروں کی کثرت دکھائی دیتی ہے اور یہ سب نواب وزیروں کی ایسے فن کاروں کی قدر افزائی پر مشتمل ہے۔

اب تک کی بحث سے دیکھا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اودھ کے سلاطین میں اہل فن و شعر کے قدردان موجود تھے۔ اس لیے ان کا زیادہ رخ اس طرف ہوا اور یہاں آکر یہ آسودہ ہوئے اور بزم سخن کو رونق بھی بخشی۔ ایک بات واضح رہے کہ یہ نہیں کہ صرف سلاطین اودھ ہی فن کے قدر دان تھے یا یہاں ہی اتنی آسائشیں تھیں۔ دلی کے سلاطین مغلیہ تو شروع سے ان کمالات اور اغراضات میں سب سے امتیاز رکھتے ہیں۔ لیکن اس دور میں تو وہ خود مفلس ہو چکے تھے۔ اور کھانے پینے کو محتاج تھے۔ تو دوسروں کی قدر کس طرح کرسکتے۔ اس کے برعکس یہاں ہر

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

لحاظ سے آسانی تھی۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی انگریزوں کی یہاں پابندیوں کے باوجود انہوں نے مرکز کو ختم کرنے کے لیے یہاں آسانیاں بھی دی ہوئی تھیں۔ اگر ایک گورنر ناراض ہوتا تو دوسرا ان کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔ اس وجہ سے یہاں زیادہ خوشحالی تھی اور دلی میں لٹنے والوں کے لیے یہاں گوشۂ عافیت زیادہ موجود تھا۔ گو میر کو دلی کبھی نہ بھولی یا دوسرے چند فن کاروں نے بھی اسے یادرکھا اور لکھنؤ سے تنگ بھی آئے جس کا ثبوت ان کے کلام میں ملتا ہے کہیں زندگی گذارنا سب سے زیادہ بڑا مسئلہ تھا او وہ یہیں آسانی سے گزرتی نظر آتی تھی لہذا دلی سے آنے والے شعراء اور فن کاروں نے یہاں ہی قیام کیا اور یہیں بقیہ عمر گزاری۔

دہلی سے اردو شعراء کی ہجرت دہلی میں سیاسی اور معاشرتی انتشار کے نتیجے میں پیدا ہوئی، اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد اور مغلوں کا مسلسل زوال برطانوی قبضے کا سبب بنا، مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی مختلف قوموں نے سر اٹھایا اور دہلی کو تخت و تاراج کیا جس سے دہلی میں رہنا ایک طرح سے ناممکن ہوگیا تو عوام الناس نے جن میں شعراء اور فنکار بھی شامل تھے، دہلی سے ہجرت کرنا مناسب خیال کیا۔ اودھ کی سلطنت ان مہاجرین کے لیے پرکشش جگہ تھی جہاں شعرا اور فنکاروں کی قدر کی جاتی تھی۔ اودھ میں خوش حالی اور فارغ البالی کے ساتھ ساتھ شاہان اودھ شعرا کے قدر دان بھی تھے۔ دہلی سے شعراء جب اپنی زبان، سوچ اور فکر لے کر اودھ پہنچے تو اودھ کی فارغ البالی نے ان کی سوچ اور فکر کو نئی جہت دی۔ داخلیت پر خارجیت کا غلبہ ہوا، معاملات حسن وعشق میں رکھ رکھائو کی جگہ معاملہ بندی نے لے لی۔ زبان کی وضاحت میں بہتری آئی۔ شاعری میں مرصع سازی، موج مستی، قافیہ پیمائی اور مبالغہ آرائی عام ہوئی، شاعری میں نئے مضامین شامل ہوئے جس سے غزل کا دامن وسیع ہوا۔ اردو زبان میں نئے الفاظ نئے معنوں میں شامل ہوئے۔ زبان کی فصاحت، بلاغت میں اضافہ ہوا۔ شاعر دہلی کے ایک مخصوص ماحول اور موضوعات سے نکلے اور غزل کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی۔

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

حوالہ جات

1. ابوالخیر کشفی، "اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر"، لاہور، نشریات پبلشرز، 2007ء، ص ۲۳
2. ساجد امجد، پروفیسر، ڈاکٹر "اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات" لاہور، الوقار پبلی کیشنز، 2003، ص
3. ثنا الحق، "میر و سودا کا دور"، کراچی، ادارہ تحقیق و تنقید، ۱۹۶۵ء، ص ۲۲
4. غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، "اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر"، لاہور، جامعہ پنجاب، ۱۹۶۶ء، ص ۵۹
5. ابوالخیر کشفی، "اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر"، کراچی، ادبی پبلشرز، اگست ۱۹۷۵ء، ص ۲۵
6. ایضاً، ص ۱۷
7. ثنا الحق، میر و سودا کا دور، ص ۶۳
8. ابوالخیر کشفی، "اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر"، کراچی ایڈیشن، ص 36
9. ثنا الحق، "میر و سودا کا دور"، کراچی، ادارہ تحقیق و تنقید، ۱۹۶۵ء، ص ۳۵
10. غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، "اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر"، لاہور، جامعہ پنجاب، ۱۹۶۶ء، ص ۶۷
11. ایضاً، ص ۴۰
12. جمیل جالبی، ڈاکٹر، "تاریخ ادب اردو (جلد دوم)"، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع دوم، اپریل ۱۹۸۷ء، ۵۱۴
13. ثنا الحق، میر و سودا کا دور، ص ۴۰
14. ایضاً، ص 46
15. ایضاً، ص ۶۷
16. ایضاً، ص ۶۹
17. صفدر حسین، ڈاکٹر سید، "لکھنؤ کی تہذیبی میراث"، لاہور، بارگاہ ادب، ۱۹۷۵ء، ص ۱۳4
18. ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، "لکھنو کا دبستان شاعری"، کراچی، غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۱۹۸۷ء، ص ۴۷
19. باقر علی شاہ، "شاعری کا دبستان دہلی و لکھنو" لاہور، اظہار سنز، سن۔ ندارد، ص 20

کتابیات

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

- ابوالخیر کشفی، "اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر"، کراچی، ادبی پبلشرز، ۱۹۷۵ء
- ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، "لکھنو کا دبستان شاعری"، کراچی، غضنفر اکیڈمی، ۱۹۸۷ء
- باقر علی شاہ، "شاعری کا دبستان دہلی و لکھنو" لاہور، اظہار سنز، س ن
- ثنا الحق، "میر و سودا کا دور"، کراچی، ادارہ تحقیق و تنقید، ۱۹۶۵ء
- جمیل جالبی، ڈاکٹر، "تاریخ ادب اردو (جلد دوم)"، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع دوم، ۱۹۸۷ء
- سلیم اختر، ڈاکٹر، "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ"، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء
- صفدر حسین، ڈاکٹر سید، "لکھنؤ کی تہذیبی میراث"، لاہور، بارگاہ ادب، ۱۹۷۵ء
- غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، "اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر"، لاہور، جامعہ پنجاب، ۱۹۶۶ء